مولانا رئیس احمد جعفری

ہنومان گڑھی کی مسجد بابری

اودھ کا صوبہ اب ملک بن چکا تھا اور یہاں "بادشاہت" قائم ہو چکی تھی۔ پہلے یہاں کے فرمانروا "نواب وزیر" کہلاتے تھے کہ در حقیقت ان کا منصب وزارت تھا۔ شہنشاہ دہلی کے یہ وزیر تھے اور اسی کی طرف سے یہاں حکومت کرتے تھے لیکن انگریزوں نے دلّی کے توڑ پر لکھنؤ کو بڑھایا اور اودھ کے فرمانرواؤں کو وزیر سے بادشاہ بنا دیا۔

لیکن یہ بادشاہت مصنوعی تھی۔ انگریز یہاں کے در و بست پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کا ریزیڈنٹ کار سلطانی بجا لاتا تھا اور نوابان اودھ بے چون و چرا ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ داخلی اور خارجی تمام معاملات میں ریزیڈنٹ کی رائے فیصلہ کن ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد پھر کسی کو مجال دم زدن نہ تھی۔

لیکن اودھ کے عوام زیادہ بیدار، زیادہ ہوشیار اور زیادہ خود دار تھے۔ وہ انگریزوں کے وجود کو اور ان کی دسیسہ کاریوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا طور ایسا بنا لیا تھا کہ ایک مشترک تمدن، مشترک معاشرت اور مشترک تہذیب کو کچھ اس طرح اپنی زندگی میں سمو لیا تھا کہ ہندو مسلم سوال کبھی نہیں پیدا ہوا۔ شیعہ سنی مسئلہ بھی کبھی نہیں اٹھا۔ لکھنؤ میں جو مجتہد العصر تھے ان کے اور علمائے فرنگی محل کے درمیان نہ صرف تعلقات اور روابط اچھے تھے بلکہ دونوں ایک دوسرے سے علمی استفادہ بھی کرتے تھے۔ اردو زبان نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو شیر و شکر بنا دیا تھا۔ وضع قطع، لباس، رہن سہن، آداب معاشرت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے دونوں میں حد درجہ اتحاد تھا۔ وہاں کے ہندو بے ساختہ "الحمد للہ" "لاحول ولا قوۃ"، "استغفر اللہ"، "انشاء اللہ" اور اسی طرح کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے اور ذرا اجنبیت محسوس نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی کتاب لکھتے تھے، خواہ وہ کسی علم و فن سے ہو، اس میں حمد، نعت اور منقبت اسی شان اور زور شور سے ہوتی تھی جیسی مسلمان مصنفوں کے ہاں پائی جاتی تھی۔ اس حمد و نعت اور منقبت میں آورد نہ تھی، آمد، روانی اور بے ساختگی تھی، اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ انھوں نے مشترک طرز حیات

میں خوشی سے اور رضا کارانہ طور پر حصہ لیا تھا۔

انگریزوں نے بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کو شکست دے کر ہر نئے فرمانروا کے عہد میں زیادہ مراعات اور مفادات حاصل کرنے کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ نواب سعادت علی خاں زیادہ ہوش مند تھے ان کا خیال تھا وہ اپنے تدبر اور تدبیر سے انگریزوں کو مات دیدیں گے لیکن سب سے زیادہ نقصان انگریزوں سے انھی کو پہنچا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔

بہرحال کیفیت یہ تھی کہ اونچی سطح پر برطانوی استعمار اور اودھ کی نوابی میں بالادستی اور زیردستی کا تعلق قائم تھا، لیکن جہاں تک عوام کا تعلق تھا ان میں مذہب و ملت اور نسل و قوم سے ماورا بڑی حد تک برادرانہ تعلقات قائم تھے اور یہ عہد درجہ محکم تھے۔

انگریزوں کے دوررس مقاصد کے لیے یہ چیز خاصی تشویش ناک تھی۔ وہ اس وقت تک اپنے عزائم اور مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جب تک ہندو مسلم تفرقہ عالم وجود میں نہ آجائے اور یہ دونوں قومیں باہم دگر نفرت اور بدگمانی کا شکار نہ ہو جائیں۔

اسے انگریزوں کی دراندازی کہیے یا حالات و حوادث کی ستم ظریفی یا قسمت کی خرابی کہ ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جو انگریزوں کے بالکل حسب دل خواہ تھا۔ یہ واقعہ تھا ہنومان گڑھی کی تاریخی مسجد کا جو مسجد بابری کے نام سے اب تک یاد کی جاتی ہے اور جس پر آزادی ہند کے بعد ہندوؤں کا عمل قبضہ ہو چکا ہے۔ وہاں کے محراب و منبر سے اب صدائے اللہ اکبر نہیں گونجتی بلکہ اصنام کی جلوہ نمائی ہوتی ہے ——— انقلابات ہیں زمانے کے۔

ہنومان گڑھی کی مسجد سے متعلق ذیل میں تاریخی حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔

اجودھیا ہندوؤں کا مقدس ترین مقام ہے۔ رام چندر جی کا جنم استھان یہی ہے، سیتا کی رسوئی بھی یہیں ہے۔ مغل فرمانرواؤں کا اصول تھا اور اس اصول پر بابر سے لے کر عالمگیر تک بلکہ اس کے بعد تک عمل درآمد جاری رہا کہ جہاں ایک طرف پوری رواداری، وسعت قلب اور دریادلی کے ساتھ ہندو معابد کو جاگیریں عطا کی جاتی تھیں، وہاں ان مندروں کو مسمار کر دیا جاتا تھا جنھیں سازشی مرکز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ متھرا، بنارس، اجمیر وغیرہ میں جہاں مندروں کی جگہ پر مسجدوں کے مناسے سربلند نظر آتے ہیں وہیں مندر تھے جہاں حکومت کے خلاف سازش کی اسکیمیں تیار کی جاتی تھیں۔ چنانچہ شہنشاہ بابر نے ۹۳۴ھ

میں جنم استھان کے بت خانہ کے پاس سیتا کی رسوئی کے نزدیک ایک مسجد تعمیر کرادی۔ یہ نہایت عالی شان مسجد تھی۔ سید موسیٰ عاشقاں کے زیر اہتمام اس کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ اس کی تاریخ تعمیر "خیر باقی" ہے جس سے ۹۲۳ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ اس مقام پر تین مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں۔ ایک تو مذکورہ بالا، دوسری سرگ دوار اور تیسری ترتیا کے مقام پر تعمیر ہوئی، دریائے سرجو پر سرگ دوار ہے جس کی پیمائش ۱۳×۱۸ گز ہے۔ یہاں رام گھاٹ کے پاس مسجد فدائی خاں صوبیدار نے بنوائی تھی۔ یہ مقام بھی متبرک مانا جاتا تھا، اسے ہندوؤں نے اپنی اکثریت اور دارالحکومت کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس طرح منہدم کر دیا کہ صرف ایک دیوار اور دو منارے باقی رہ گئے۔ امجد علی شاہ کے وقت میں اس کی تعمیر کا حکم دربار شاہی سے صادر ہوا تھا لیکن تعمیل سے قبل وہ وفات پاگئے۔ ایک مسجد قلعہ میں تھی۔ یہ قلعہ لچھمن منت کو معاف ہوگیا، اس لیے وہاں مسلمانوں کی آمد و رفت بند ہوگئی۔ اجودھیا میں ایک ٹیلہ تھا۔ اس مقام پر رام چندر جی نے ہنومان کو لنکا فتح کرنے کے بعد بٹھایا تھا۔ اس لیے اس کا نام ہنومان گڑھی یا ہنومان بیٹھک پڑگیا درحقیقت یہ قلعہ کا پھاٹک تھا۔ لیکن اجودھیا کے برباد ہو جانے کے بعد، اس مقام پر ایک املی کا درخت اور ٹیلہ باقی رہ گیا۔ یہاں بھی اورنگ زیب عالمگیر نے ایک شاندار مسجد بنوادی تھی۔ ہندو اس کو منہدم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ برہان الملک کے زمانے میں ہندوؤں نے مسجد مسمار کر دی۔ لیکن سرکاری فوج نے اس کی مرمت کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد ایک ہندو فقیر املی کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنا کر رہنے لگا۔ پھر اس میں بت رکھ کر ہنومان گڑھی کے نام سے اسے مشہور کر دیا۔ مسجد میں ایک مسلمان فقیر رہتا تھا۔ نماز پڑھتا اور اذان دیتا تھا۔ عشرہ محرم میں مسجد کے پہلو پر جو چبوترہ تھا وہاں تعزیہ بھی رکھا کرتا تھا۔ املی والے فقیر نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، لیکن کچھ مدت کے بعد جب فقیر مرگیا تو بیراگیوں نے مسجد کا منبر توڑ ڈالا، لیکن قاضی حبیب اللہ نے گذشتہ صورت پھر بحال کر دی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کا نام و نشان مٹا دیا۔

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہنومان گڑھی کی داخلی مسجد منہدم کے علاوہ مسجد بابری جہاں سیتا کی رسوئی تھی اس کے صحن میں بھی ہندوؤں نے بت خانہ بنایا، یہی حشر مسجد رام گھاٹ کا بھی ہوا۔

۱۲۷۱ھ میں بہ عہد واجد علی شاہ ایک مرد درویش شاہ غلام حسین نے مولوی محمد صالح کے تعاون اور اعانت سے مسجد کی تجدید کے لیے بہ عزم جہاد گومتی دریا کے پار محمدی جھنڈا قائم کیا۔ حسن علی خاں بانکے کا

بیٹا احسان علی خاں رسالدار بھی ان کے ساتھ ہوگیا، اور بھی کئی لوگ اس کام میں شریک ہوگئے جن میں غریب اور مفلوک زیادہ تھے۔ مجاہدوں کا یہ قافلہ فیض آباد کی طرف اجودھیا جانے کے لیے روانہ ہوا دناہی جب پہنچے تو اعلیٰ علی نے جو آغائی صاحب ناظم کے قائم مقام تھے، اپنے کارندوں کے ساتھ راستہ روکا۔ اب شاہ صاحب نے لکھنؤ کا راستہ لیا، اور جو لوگ فیض آباد پہنچ گئے تھے انھیں نثار حسین نائب کوتوال اور کپتان الیگزنڈر آر نے باتیں بنا کے رخصت کر دیا۔ یہ خبر جب بادشاہ کو ملی تو انھوں نے تحقیقات کا حکم دیا۔ اس اثنا میں شاہ صاحب کے کچھ آدمی مسجد بابری میں مقیم تھے، پھر خود بھی آ گئے۔ مولوی صالح بھی ان کے ساتھ تھے۔ کپتان الیگزنڈر آر اور مرزا منعم بیگ کوتوال نے عام مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینے سے روکا اور ہندوؤں کی خفیہ اور علانیہ مدد کرتے رہے۔ راجہ مان سنگھ اور راجہ کشن دت رام پانڈے چکلہ دار اور دوسرے ہندو زمیندار گرد و پیش کے ہزارہا ہزار کی تعداد میں آ موجود ہوئے، مگر مسلمان تعلقہ داروں، ان کے کارندوں اور امرائے شہر کی حمیت دینی اور غیرت مذہبی اس کے بعد بھی بیدار نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ دس ہزار ہندو جمع ہو گئے اور انھوں نے دریائے گھاگرا کے گھاٹ بھی روک لیے کہ اس طرف سے مسلمانوں کو موہوم سی امید جو کمک کی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ مولوی صالح اور شاہ غلام حسین کے ساتھ سو آدمی تھے وہ بھی غریب اور مفلوک، کسی بڑے اور نمایاں آدمی نے ساتھ نہ دیا۔ کھانے تک کا ان لوگوں کے ہاں بندوبست نہ تھا۔ کبھی فاقہ کر لیا، کبھی دو لقمے حلق میں ڈال لیے۔ اس کش مکش اور یلغار و یورش کا نتیجہ یہ نکلا کہ دس اور ایک روایت کے مطابق بارہ ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ مطابق جولائی ۱۸۵۵ء کو کم و بیش تین سو مسلمان فریضہ نماز ادا کرنے مسجد بابری میں کہ سیتا کی رسوئی میں ہے جمع ہوئے۔ شاہ صاحب نے امامت کی بیراگیوں اور عام ہندوؤں نے مسجد کو گھیر لیا۔ حکومت کے افسر اور کارندے جو زیادہ تر مسلمان تھے، اتنے بے حس اور بے ضمیر ہو چکے تھے کہ رشوت لینے کے باعث منہ پھیر کر ہٹ گئے اور غیر جانبداری کے ساتھ یہ منظر دیکھنے لگے۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ قضا سر پہ منڈلا رہی ہے تو بزدلی کی موت مرنے پر بہادری کی موت مرنے کو ترجیح دی۔ رستم علی خاں، بہادر علی خاں، فقیر بخش نائی (حجام) بہادر خاں اور ایک اور مجاہد شمشیر بکف سامنے آئے۔ لڑائی ہوئی۔ ان مٹھی بھر مسلمانوں نے بہت سے ہندوؤں کو تہ تیغ کیا اور لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔ اب مسجد کے اندر جو لوگ تھے تلواریں سونت کر جھپٹے۔ مان سنگھ

تعلقہ وارگے آور وسے حائل ہوئے۔ یہاں بھی رن پڑا۔ مقتولوں کا حساب ہوا تو ہندو مقتولین کی تعداد زیادہ نظر آئی۔ یکایک بارش شروع ہوگئی۔ جنگ رک گئی، مجاہد مسجد میں چلے گئے۔ ایک مسلمان کھانا لے کر آیا۔ یہ لوگ کھانے لگے۔ الیگزنڈر آر، اور جان ہرسی، مرزا اعلیٰ علی، مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ کے ذرا فاصلے پر ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو پیام بھیجا کہ آپ مطمئن رہیں کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ دلجمعی کے ساتھ مسجد میں مقیم رہیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ہزاروں بیراگی یورش کرتے ہوئے آئے اور مسجد کا محاصرہ کر لیا، اور شاہ غلام حسین کے ساتھیوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں مسجد میں آکر مجاہدوں کو ذبح کیا۔ ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ صحن مسجد خون مسلمان سے لالہ زار بن گیا۔ اکثر مسلمانوں کے گلے میں قرآن شریف حمائل تھے، ان کے پرزے پرزے کر کے پاؤں سے روندا اور جلایا۔ مقتولین کی لاشوں کو مرزا نثار حسین نے دوسرے دن ایک بڑا غار کھدوا کر گل در گل دفن کر دیا۔ ان کی شہادت کی تاریخ کسی نے "بلغ العلیٰ" سے نکالی ہے جس کے عدد ۱۲۷۱ھ بنتے ہیں۔

رام سہائے نے افضل التواریخ میں لکھا ہے کہ شاہ غلام حسین کے ساتھ ایک سو تین آدمی تھے، جنھوں نے جام شہادت نوش کیا۔ ان کے دفن کے بعد بیراگی مسجد میں جوتیاں پہنے آئے، ہون کیا، سنکھ بجایا قریب ہی سید سالار مسعود غازی کے شہدا میں خواجہ بیٹھے کی قبر تھی، اسے مسمار کر دیا۔

یہاں یہ ہو رہا تھا، وہاں سرکاری تحقیقاتی کمیٹی نے حادثۂ ہائلہ کے بعد "تحقیق" شروع کی کہ آیا یہاں مسجد تھی بھی یا نہیں؟ اکثر مقتدر اور صاحب حشمت لوگوں نے نہ صرف مسجد کے وجود کی شہادت دی بلکہ اس میں اپنے نماز پڑھنے کا اعتراف بھی کیا۔ قاضی یار علی نے سابق کے کئی محضر دکھائے جن سے مسجد ثبوت ملتا تھا۔ حد یہ ہے کہ بعض ہندوؤں نے مسجد کے وجود کی شہادت دی۔

تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ جب علی نقی خاں وزیر اعظم کے سامنے پیش ہوئی تو اس نے اسے تسلیم نہیں کیا بلکہ آغائی صاحب اور راجہ مان سنگھ ——— جو مدعا علیہ تھا ——— کو تحقیق مزید کے کام پر مامور کیا۔ ان دونوں نے اصل مسئلے پر تحقیق کرنے کے بجائے مہنتوں، بیراگیوں اور ہندوؤں سے ایک صلح پر دباؤ ڈال کر مسلمانوں سے دستخط کرا دیے۔ علی نقی خاں کا مقصد حاصل ہو گیا واجد شاہ کا منظور نظر تھا ہندوؤں نے بھی اسے سر پر چڑھا لیا اور موقع پرست مسلمان بھی اس کی مدح و ثنا کرنے لگے۔

لیکن اتنا بڑا حادثہ بالا بالا نہیں جا سکتا تھا۔ علمائے لکھنؤ نے کہا آج یہ واقعہ ہنومان گڑھی سے

ساتھ گزرا ہے کہ اسے کھود ڈالا تو کل ہر خانۂ خدا میں ایک بت نظر آئے گا۔ آخر کار علمائے فرنگی محل میں سے مولوی عبدالرزاق اور بندگی میاں کے پوتے مولوی سید امیر الدین علی، عرف مولوی امیر علی، ساکن قصبہ امیٹھی نے جہاد کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے آدمیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ نقی علی خاں علمائے فرنگی محل کی شرکت سے بہت گھبرایا۔ اس نے دھوکا دے کر اور غلط وعدہ کر کے انھیں لکھنؤ واپس بلوا لیا۔ جب وہ آئے تو خلعت اور زر نقد پیش کیا جسے قبول کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔ لیکن پھر اس معرکے میں شریک نہ ہو سکے۔ مولوی امیر علی کو بھی علی نقی نے طلب کیا، اور انھیں ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن اس مرد مجاہد کے کڑے تیور، اور صاف گوئی نے اسے مایوس کر دیا۔ خاموش ہو رہا اور وہ روانہ ہو گئے۔

یہ خبر آگ کی طرح اطراف و اکناف میں پھیل گئی اور ولولۂ جہاد مسلمانوں میں پیدا ہو گیا۔

انگریز یہی چاہتے تھے۔ وہ ایک تیر میں دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی قوت توڑنا اور واجد علی شاہ کو بغیر کسی خطرے کے معزول کرنا تاکہ بھارت کا یہ سب سے زیادہ سرسبز و شاداب، زرخیز اور وسائل سے مالامال علاقہ ان کے ہاتھ میں آ جائے اور اب اس کا وقت آ گیا تھا۔

چنانچہ جنرل اوٹرم جو ریزیڈنٹ تھے ایک روز واجد علی شاہ کے پاس آئے اور فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین زبردست فساد کا اندیشہ ہے، اس فتنہ انگیزی کا موجب امیر علی ہے اسے قرار واقعی سزا دینی چاہیے۔ ارکان سلطنت پر اس صورت احوال کا تدارک لازم ہے۔ یہ ریزیڈنٹ کا مشورہ نہ تھا مشورہ ہوتا تو بھی نہیں ٹالا جا سکتا تھا یہ تو حکم تھا اور اس کی تعمیل میں تامل و تذبذب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

علی نقی خاں نے مزید اقدام یہ کیا کہ ایک طرف بادشاہ کو باور کرایا کہ ہنومان گڑھی میں مسجد کا وجود ثابت نہیں ہے، دوسری طرف جنرل اوٹرم کو جو ریزیڈنٹ تھے تفصیلی اطلاع بھیجی کہ راجہ نصرت جنگ اور قائم جنگ راجہ مان سنگھ دیا در ہے یہ بانی فساد اور مدعا علیہ تھا) اور تہور علی رسالدار کے بیانات سے اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ ہنومان گڑھی میں کوئی مسجد سرے سے تھی ہی نہیں۔

اس اطلاع سے، جس کے ہندو مسلم اتحاد اور واجد علی شاہ کے مستقبل پر جو اثرات بد پڑنے والے تھے اوٹرم صاحب ان سے بخوبی واقف تھے یہ حسب دل خواہ دستاویز پا کر وہ بہت خوش ہوئے چنانچہ گورنر جنرل کو اس مفہوم کی رپورٹ انھوں نے بھیج دی اور علی نقی خاں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

"ارباب حکومت نے اس معاملۂ خاص میں حق و انصاف سے کام لیا، اور مذہب و ملت کی رعایت نہیں کی۔ حاکم اور فرماں روا کو ایسا ہی منصف اور عادل ہونا چاہیے۔"

ان کارروائیوں سے مولوی سید امیر علی ناواقف نہ تھے۔ انھوں نے حکومت کی روش سے مایوس ہوکر جہاد کا فیصلہ کر لیا اور عازم اجودھیا ہوئے۔ علی نقی خاں کے حکم سے یا دوسرے الفاظ میں جنرل اوٹرم کے حکم سے توپ خانہ اور تلنگوں کی پلٹن اور نقیب کپتان بارلو و حاجی مرزا حسین علی کمیدان کالا پلٹن کی ماتحتی میں روانہ ہوئے۔ اس فوج میں قدرتاً زیادہ تر سپاہی اور منصب دار مسلمان تھے۔ اس فوج کو حکم دیا گیا کہ مولوی صاحب کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ ساتھ ہی ساتھ ریزیڈنسی سے متواتر تاکیدی "مشورے" یا بالفاظ دیگر احکام آنے لگے کہ "اس فتنے کا جلد انسداد کیا جائے۔" آخر ریزیڈنٹ نے یہ الفاظ واضح کہہ دیا کہ اگر اس فتنے کا سدِ باب نہ کیا گیا تو حکومت اودھ کا قائم رہنا مشکل ہے۔

افضل التواریخ میں رام سہائے نے لکھا ہے کہ حکومت نے مولوی سعد اللہ کی سرکردگی میں ۲۲ علما کا وفد مولوی صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ انھیں ان کے ارادہ سے باز رکھے اور واپس لے آئے۔ مگر مولوی صاحب نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ لیکن صاحب "حدیقۂ شہدا،" (جس کا ذکر آگے آئے گا) نے ملاقات تسلیم کی ہے۔ بہر حال مولوی سعد اللہ نے لشکر مجاہدین میں وعظ کہا کہ اولی الامر کی اجازت اور حکم کے بغیر جہاد غلط ہے۔ ان کے وعظ سے متاثر ہوکر تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے مولوی صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ مولوی صاحب اہل علم میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی بعض تالیفات مثلاً میزان الافکار، شرح معیار الاشعار اور شرح فصول اکبری بہت مشہور ہیں۔

جمعرات کو عصر کے وقت مولوی صاحب کے پیچھے لشکر میں کوچ کا نقارہ بجا۔ فوج نے روکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئی۔ دریاباد میں ڈاک بنگلے کے قریب مولوی صاحب نے پڑاؤ کیا۔ نماز با جماعت ہوتی تھی جس میں شاہی فوج کے بے شمار مسلمان افسر اور سپاہی سب شریک جماعت ہوتے اور مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ ایک طرف مولوی صاحب کی امامت میں نماز، دوسری طرف نماز کے بعد ان کے قتل کی تدبیر۔

اب حکومت کی طرف سے پروانہ آیا کہ مجاہدین تک رسد کسی طرح نہ پہنچنے پائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی مجاہدین پر فاقے گزرنے لگے۔ اس مصیبت کی تاب نہ لاکر بہت سے مسلمانوں نے مولوی صاحب کا ساتھ

چھوڑ دیا۔ مولوی صاحب نے اپنے برادر نسبتی شیخ حسین علی سے جو فوج شاہی میں تھے فرمایا:

"خدا کا شکر ہے تم نے اور تمھاری فوج نے زمانۂ سابق (کربلا) کی طرح ہم پر آب و دانہ بند کیا ہے۔"

حسین علی شرمندہ ہوئے اور رسد کا بندوبست کر دیا، اور خود علی نقی خاں کے پاس جا کر صورت حال کی وضاحت کی۔ علی نقی خاں اب خود بے بس تھے کہنے لگے،

"اب خوف تنزل سلطنت ہے۔ مسجد پھر بھی بن سکتی ہے۔"

حکومت نے علمائے حنفیہ و امامیہ سے مولوی صاحب کے قتل کا فتویٰ مانگا مگر کسی نے نہ دیا۔ صرف چند علما ایسے تھے جنھوں نے حکومت کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے فتویٰ دیدیا۔

اب حکومت کی طرف سے سراج الدولہ کمیدان اس غرض سے بھیجا گیا کہ مجاہدین میں تفرقہ پیدا کرے اور انھیں فہمائش کر کے واپس لائے۔ اس کی باتوں میں آکر بریلی، رام پور، اور پیلی بھیت کے کچھ لوگ واپس چلے گئے۔

اب صرف چھ سو مجاہدین رہ گئے جن پر کڑے فاقے گزر رہے تھے۔ راجہ محمود آباد نواب علی خاں اور شیخ حسین علی مختلف ذرائع سے پچاس پچاس روپے یومیہ مصارف مجاہدین کے لیے دیتے تھے لیکن اس سے دال دلیا چلنا بھی مشکل تھا۔ میر عباس، مشہور پیر اک میرک جان کا بھانجا، جس کا ذکر فسانۂ عجائب میں لکھنؤ کے زمرۂ اہل کمال میں ملتا ہے، لشکر مجاہدین کا کوتوال تھا۔ اسی کی معرفت روپیہ تقسیم ہوتا تھا۔

۲۶ر صفر ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ر نومبر ۱۸۵۵ء بدھ کے دن مولوی صاحب نے نماز باجماعت ادا کی اور لشکر مجاہدین لے کر روانہ ہوئے۔ اب صرف تین سو آدمی ساتھ رہ گئے تھے۔ کپتان بارلو کو یہ خبر ملی تو اس نے چار کمپنیوں اور دو توپوں کے ساتھ تعاقب کیا۔ تین کمپنیاں گلابی پلٹن کی، حاجی مرزا حسین کی ماتحتی میں جلیں۔ شیخ حسین علی نے مولوی صاحب کے قدموں پر ٹوپی رکھ کر وعدہ کیا کہ مسجد بن جائے گی۔ وہ بارلو کا بھیجا ہوا اور پڑھایا ہوا آیا تھا۔ مولوی صاحب چند روز تک توقف پر آمادہ ہو گئے۔ شیخ صاحب یہ دھوکا دے کر کھسک گئے۔ مجاہدین کے ساتھ نہ کوئی ساز و سامان تھا نہ مال و اسباب، دو دن کے بھوکے پیاسے، ایک منزل کے تھکے ماندے یکایک بارلو نے فائر کرنے کا حکم دیا۔ گولی چلنے لگی، مولوی صاحب سخت زخمی ہوئے۔ لیکن مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اسی اثنا میں کمیار کے تعلقہ دار اور ٹھاکر سنگھ بھیلیہ کے آدمی لشکر مجاہدین کے عقب سے وارد ہوئے۔ ظہر کے وقت لڑائی شروع ہوئی تھی شام تک

جاری رہی ۔ پانچ سو ہنود کھیت رہے ۔ مسلمان بھی لڑتے لڑتے شہید ہوئے ۔ ان شہیدوں میں سردار لشکر مجاہدین مولوی سید امیر علی ۔ بھی تھے ۔ تاریخ قتل یہ ہے:

گفت از روئے ہمت ازلی   قتل شد مولوی امیر علی
۱۲۷۲ھ

قتل کے وقت مولوی صاحب کا سر الگ گرا، دھڑ جدا ۔ ایک تاریخ میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے :

سر بجا و تنش بجائے دگر
۱۲۷۲ھ

"نقش سلیمان" میں تحریر ہے کہ مولوی سید امیر علی نے اپنی تاریخ وفات خود اپنی زندگی میں کہہ لی تھی جو یہ ہے:

بہ ذکرِ حق سراپا گوش دارم   بشئے مہر علی در جوش دارم
شنو تاریخ من قبل از شہادت   سر میداں کفن بر دوش دارم
۱۲۷۲ھ

راجہ کمیار نے میدان چھوڑنے والوں کا تعاقب کیا اور چن چن کر قتل کیا ۔ مولوی صاحب اپنے سجادے پر رو بہ قبلہ گرے ۔ ایک سپاہی نے ان کی گردن کاٹ لی ۔ بارلو نے وہ سر علی نقی خاں کے پاس بھجوا دیا ۔ اس نے کہا کیا لکھنؤ میں بھی قیامت برپا کرنا چاہتے ہو؟ ریزیڈنٹ صاحب کو یہ کٹا ہوا سر دکھا کر دھڑ سے ملا کر وہیں دفن کر دو ۔ سر لانے والے ڈرے کہ اگر کسی مجاہد نے دیکھ لیا تو ہماری جان پر بن جائے گی ۔ لہذا جہاں موقع ملا ، سر پھینکا اور چل دیے ۔ افضل التواریخ میں رام سہائے نے لکھا ہے کہ قصبہ جینٹ میں لب تالاب دفن کر دیا ۔ مولوی صاحب کے ہاتھ سے تلوار جدا نہ ہوتی تھی لہذا کلائی کو ہاتھ سے کاٹ دیا ۔ کپتان بارلو کے حکم سے راجہ شمشیر بہادر کے آدمیوں نے دس کوس تک مجروحین کا تعاقب کیا ، اور انھیں شہید کر ڈالا ۔ صرف میر عباس کوتوال لشکر بہ صد دقت جان بچا کر گھر پہنچنے میں کامیاب ہوئے ۔ صاحب قیصر التواریخ نے کہ سرکاری آدمی تھے اور ریزیڈنٹ کے اہلکار بھی تحریر فرمایا ہے :

"مولوی صاحب کا مقبرہ بنا دیا گیا ہے جہاں ہر جمعرات کو لوگ جمع ہوتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں ۔"

اس حادثۂ ہائلہ کی خبر دہلی پہنچی تو مولوی امام بخش صہبائی نے ایک دل دوز مرثیہ لکھا جس کے چند شعر درج ذیل ہیں :

سید مظلوم را کردند بے دینان شہید — تف بہ اہل لکھنؤ، لعنت بہ کار لکھنؤ
بہر در و دیوار او از شش جہت نفریں کنند — بر صغار لکھنؤ و بر کبار لکھنؤ

تذکرۂ حکومت المسلمین میں مرقوم ہے کہ سید امیر علی کا جہاد حکومت اودھ کی بے انتظامی کا ثبوت بن گیا، چنانچہ اس خونیں حادثے کے صرف تین ماہ بعد واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے اور حکومت "کمپنی بہادر" کے تسلط اور قبضے میں آگئی۔ کسی دل جلے نے دیوان حافظ سے تفاؤل کیا تو یہ شعر نکلا

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را — چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

"حدیقۂ شہداء" میں مزید تصریحات کے ساتھ وہی تفصیلات ملتی ہیں جو مذکور ہوئیں۔ اس کتاب کے مصنف مرزا جان ہیں جو امیر المجاہدین کے رفیق ہیں۔ یہ حادثہ ۱۲۷۱ھ میں پیش آیا تھا، حدیقۂ شہداء ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی۔ اتنی قریبی معاصرانہ تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

حدیقۂ شہداء میں تحقیقاتی رپورٹ اور تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے جو بیانات ہوئے ان کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ اس میں دو ہندوؤں کے بیانات بھی مسجد کے وجود کے بارے میں ملتے ہیں۔ چھیدی لال تنبولی نے بیان کیا:

"بارہا مسجد را بہ چشم خود دیدہ ام"

دھنی سنگھ چپراسی عدالت فیض آباد برائے قرقی کا بیان ہے:

"بر ہنومان گڑھی رفتہ بودم، مسجد واقع ہنومان گڑھی بہ چشم خود دیدہ ام۔"

حدیقۂ شہداء میں امیر المجاہدین سید امیر علی اور واجد علی شاہ کی ملاقات اور گفتگو کا تذکرہ بھی ہے مصنف کے الفاظ یہ ہیں:

"نواب صاحب نے پہلے کشتی خلعت منگائی۔ پان سو روپے کی تھیلی ساتھ آئی۔ در گفتگو باز ہوا، نواب نے فرمایا، خلعت پہنیے، روپیہ لیجیے، چندے بسر کیجیے۔ عن قریب بشرط ثبوت تعمیر خانۂ خدا ہو جائے گی۔ امیر المجاہدین نے کہا ہم لوگ خدا کی راہ میں جان پر کھیلے ہوئے ہیں، ہمیں خلعت اور انعام سے کیا کام؟ اس خلعت کا بد انجام ہے، ہم کسی کے عامل نہیں، چکلہ دار نہیں، مصاحب نہیں سپہ سالار نہیں، خلعت لے کر کیا کریں؟ کیوں آپ کو رسوا کریں؟ یہ خلعت اور انعام نہیں، دنیا کے لیے دین سے چشم پوشی ہے، ہمارا خلعت یہ ہے کہ رخصت جہاد ہو، اجازت سفر فیض آباد ہو۔"

صاحب حدیقۂ شہداء نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیعہ بھی اس معاملے میں امیر المجاہدین کے ساتھ تھے، وہ فرماتے ہیں :

"حاجی بشیر الدولہ بہادر باایں ہمہ کہ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے دن بھر میں دس گیارہ مرتبہ مزاج کی خبر منگواتے تھے۔ اکثر یہ کہتے تھے کہ خدا اسلام کی آبرو، اور دین کی دھوم چار سو رکھے، ایسا ملال تھا کہ نہ کچھ پیتے تھے نہ کھاتے تھے۔"

خالص سرکاری دستاویز یعنی Gazetteer of The province of Oudh Vol. I. P. 7, para 2 میں جو ۱۸۷۷ء کی طبع شدہ ہے بعض نئی باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً :

"دروازے کے باہر وہ مسلمان شہید دفن ہوئے جسے گنج شہیداں Martyr's graves کہتے ہیں۔"

درگا پرشاد کی کتاب "تاریخ اجودھیا" ۱۹۰۲ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوئی ہے اس میں بھی بعض معلومات دلچسپ ہیں۔ اس حادثے کا ذکر صفحہ ۱۷ سے ۲۰ تک ہے۔ منشی درگا پرشاد اپنی کتاب میں اس حادثۂ المیہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

"ہنومان گڑھی، یہ ایک مقام بہت نامی گرامی ہے۔ اس کے حالات یہ ہیں کہ بعد فتح لنکا سری مہاراج رام چندر نے اپنے سرداروں کے متعلق ایک ایک مقام خاص کیا تھا۔ چنانچہ یہ مقام ہنومان جی کے متعلق ہوا جو قلعہ کا پھاٹک تھا۔ لیکن خرابی اجودھیا کے بعد صرف اس قدر نشان باقی رہا کہ اس مقام پر ایک املی تھی اسی کے نیچے ہنومان جی کی پوجا ہوتی تھی۔ نواب منصور علی صفدر جنگ کے وقت میں ابھے رام بہت بڑا فقیر کامل تھا۔ ہنومان جی نے اس کو خواب میں اپنے درشن دیے اور تعمیر مندر کے لیے ہدایت کی۔ مشہور ہے کہ اس مندر کی تعمیر میں نواب صاحب نے بہت مدد فرمائی لیکن وقتاً فوقتاً اس کی تعمیر میں بہت تغیر و تبدل واقع ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں اس مندر کے متعلق بہت جھگڑا ہندو اور مسلمانوں میں ہوا۔ اہل اسلام بدعویٰ ایں امر کہ ہندوؤں نے شکستہ مسجد داخل تعمیرات ہنومان گڑھی سے تا جنم استھان پر قبضہ کر لیا۔ مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ کی جمعیت اور فوج نے اس ہنگامہ میں ثابت قدمی کر کے اہل اسلام کو ہٹا کر جملہ مندروں کو ان کی دست برد سے

بجا یا۔ اس درمیان میں مولوی امیر علی ساکن امیٹھی نے پیشوا بن کر علم جہاد بلند کیا۔ صاحب ریزیڈنٹ نے حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کو اس کے تدارک اور انسداد فساد کے لیے متوجہ فرمایا۔ بادشاہ نے اوّل بذریعۂ امنا معتبر و بعد ازاں بذریعۂ مرزا آغا علی خاں ناظم کے تحقیقات مقدمہ کی فرمائی چنانچہ ان سب کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ دعویٰ اہل اسلام باطل ہے اور اس مقام پر کوئی مسجد نہیں تھی۔ لیکن مولوی امیر علی با وجود فہمائش وزیر اعظم نواب علی نقی خاں اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور روانۂ اجودھیا ہوئے۔ بادشاہ نے علمائے عصر سے استفتا طلب کیا۔ سب نے بالاتفاق لکھ دیا کہ بغیر حکم بادشاہ جہاد روا نہیں ہے اور اس کے بعد ایک جماعتِ علما نے بحکم بادشاہ لشکر مسلمانوں میں جا کر وعظیں کہیں اور جانے سے روکا لیکن سوائے چند آدمیوں کے سب بلا خیال انجام کار روانہ اجودھیا ہوئے۔ بارلو صاحب افسر فوج مع چند ضرب توپ بحکم بادشاہ روانہ ہوا۔ بانسہ کے مقام پر صاحب نے آگے جانے سے ممانعت کی۔ اسی جگہ پر لڑائی واقع ہوئی۔ اہل اسلام جرأت کر کے بارلو صاحب پر حملہ آور ہوئے اور ایک توپ شاہی چھین لی۔ اس موقع پر راجہ شیر بہادر سنگھ تعلقدار کمیار مع جمعیت کثیر پہنچ گیا۔ جنگ عظیم واقع ہوئی آخر مولوی صاحب قتل ہوئے اور بہت سے ساتھیوں نے ان کا ساتھ دیا اور بقیہ لوگ مفرور ہو کر اپنے مامن و ملجا کو سدھارے۔ گو اُس وقت میری عمر بہت کم تھی لیکن مجھ کو یہ ہنگامہ اچھی طرح سے یاد ہے اور یہ خیال ہے کہ اس کا اثر نہ تنہا اجودھیا پر تھا بلکہ ہر ہر مقام پر جوش تعصب مثل سیلاب کے پھیل رہا تھا۔ لیکن امر واقعی یہ ہے کہ حضرت بادشاہ نے اس معاملے میں نہایت انصاف کو دخل دیا اور اندک تعصب اور اپنے مذہب کی طرفداری نہ کی۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس وقت مولوی امیر علی اپنے ارادے پر کامیاب ہو جاتے تو ایک آتش فساد درمیان اہل ہنود و اہل اسلام ایسی بلند ہوتی کہ جس سے برسوں کے تعلقات اور مراسم باہمی منقطع ہو کر ہر دو فریق ایک دوسرے کے تشنۂ خون ہو جاتے لیکن خدا کو ایسا منظور نہ تھا لہٰذا یہ معاملہ یہیں تک چل کر ختم ہو گیا اور ملک اودھ فتنہ و فساد سے پاک و صاف ہو کر مہد امن و امان بن گیا....

"حضرت بادشاہ کو اپنی اس نارواداری کی کتنی گراں قیمت ادا کرنی پڑی یعنی اس واقعہ کے صرف تین ماہ بعد وہ معزول کر دیے گئے۔